بدلتے ہوئے ادب پر ایک مختصر نوٹ

پروفیسر علی احمد فاطمی

A-229، لکیر گنج، الٰہ آباد۔211002 (یوپی)

تبدیلی ایک فطری عمل ہے، خارجی سطح پر بھی اور باطنی سطح پر بھی— اس تبدیلی کے پیچھے غور سے دیکھا جائے تو فلسفۂ فطرت بھی پوشیدہ ہے اور انسانی جبلّت بھی تبھی تو بہت پہلے محمد حسین آزاد نے کہا تھا— ''انسان کسی ایک حال میں خوش نہیں رہتا'' یہ بات بظاہر مذموم سی لگتی ہے لیکن اس ناخوشی کے پیچھے احساس و اضطراب کی وہ لہریں موجزن رہتی ہیں جنھیں قرار نہیں رہتا، اسی لیے وہ تبدیلی کے قدم اُٹھاتی رہتی ہیں، دیکھا جائے تو یہی فطرت ہے اور یہی دنیا کا کارخانہ بھی۔ گردشِ لیل و نہار، رنجشِ صبح و شام اور کاوشِ ہر گام انسان کا فطری عمل ہے اور یہی اس کا فکری عمل بھی۔

فنونِ لطیفہ ہو یا اقسام و اصنافِ ادب، سبھی اسی کے اِرد گرد رقص کرتے نظر آتے ہیں اور گزرتا ہوا زمانہ، پگھلتا ہوا وقت، انسان کی تلوّن مزاجی اور حرکتِ سماجی کب اور کس طرح وقت کو، رجحان و میلان کو بدل دیتا ہے، اعلان نہیں ہوتا اور تبدیلی دبے پاؤں پہلے معاشرے میں داخل ہوتی ہے۔ اس کے بعد ذہن و تخیل کے درِ نازک پر دستک دیتی ہے۔ جسے ہم اپنی نفسیات، ضروریات اور خواہشات کے بموجب قبول اور ردّ کی منزلوں سے گزر کر نئی آرزوؤں اور اُمنگوں کی دنیا میں سانس لینے لگتے ہیں۔

شعر و ادب ایسی ہی انسانی آرزو، جستجو، مسرت اور رنج و الم کا مفکرانہ و فنکارانہ اظہار ہوا کرتا ہے۔ اسی لیے اس کو تصویرِ حیات کہتے ہیں، تعبیرِ حیات بھی اور کچھ لوگ تو اسے تنقیدِ حیات بھی کہنے لگے ہیں۔ تاریخ کی طرف پلٹیے تو جتنے قابلِ قبول اور قابلِ یقین اشارے کنایے آپ کو ادب کے حوالے سے ملیں گے خود تاریخ میں بھی اتنے نہیں۔ خطوطِ غالب کی تاریخی و تہذیبی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے حادثات ہوں یا تقسیمِ ہند کے فسادات— رومانی دور ہو یا حقیقی۔ داستانی دور ہو یا غیر داستانی— ہر دور کی اپنی کچھ جدلیاتی حقیقتیں ہیں جو بڑی خاموشی سے بغیر اعلان کیے شعر و ادب کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں اور بین السطور میں اپنی زندگی کا ثبوت دے جاتی ہیں۔

جدید دور اور وہ بھی ۱۹۸۰ء کے بعد کا دور— اس میں کوئی علانیہ تحریک نظر نہیں آتی— کوئی بڑا انقلاب یا بدلاؤ بھی نظر نہیں آتا تاہم جدید اور اس کے بعد مابعد جدید دور نے زندگی اور سماج کو اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ مادیت اور انسانی لالچ اور ہوس نے ایک ایسا بازار گرم کر دیا ہے جس نے انسانی سوچ اور تخلیقی اُڑان کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہے۔ انسانی رشتوں اور انسانیت کے نرم و نازک پہلوؤں کو مسمار کر دیا ہے۔ اردو شاعری جو کبھی محبت، عشق اور رومان کے حوالے سے مقبول عام تھی اب وہاں ایک ہیجانی کیفیت ہے، بیگانگی ہے، پریشانی ہے۔ بہت پہلے ہمارے ایک سینئر شاعر علی سردار جعفری نے کہا تھا:

جب سے انسان کی عظمت پہ زوال آیا ہے
ہے ہر اک بُت کو یہ دعویٰ کہ خدا ہو جیسے

نسبتاً ایک نئے شاعر اسلم الٰہ آبادی کا شعر بھی ملاحظہ کیجیے:

گھر سے چلو تو چاروں طرف دیکھتے ہوئے
کیا جانے کوئی پیٹھ میں خنجر اُتار دے

دونسل کے شعر ہیں، ان میں نہ صرف سماجی بلکہ لسانی کلچر کا فرق بھی نظر آتا ہے، لیکن یہ حقیقت بھی ہے کہ اِس وقت انسان کو سب سے پہلے اپنے وجود کی بقا، تحفظ اور کہیں کہیں اپنی ذات کے اندرون میں ڈوب جانے والی کیفیت دکھائی دے گی۔ رشتوں کے مکر و فریب، اپنوں کی بیگانگی اور بھاگتی ہوئی زندگی، دوڑتے بھاگتے انسانی سایے اور اندھیرا۔

چند اشعار دیکھیے:

یہ کن عجیب زمانوں میں جی رہا ہوں میں
کہاں گئی مری آنکھوں کی روشن ساری

اسعد بدایونی

نہ دوستوں کی طرح ہے نہ دشمنوں کی طرح
یہ کون لوگ صفِ دوستاں میں آنے لگے

اکبر حمیدی

میں آدمی ہوں مجھے آدمی نے گھاؤ دیے
کسی چٹان میں کیسے شگاف ہوتا ہے
شاہد کلیم

جینے کو جی رہا ہوں مگر سوچتا ہوں میں
کیوں زندگی کے نام سے ڈرنے لگا ہوں میں
احمد محفوظ شاہد

ہمارے عہد کا ہر شخص بے تدبیر ہے شاید
نظر میں دھند ہے پیروں میں بھی زنجیر ہے شاید
شاہد کلیم

اشعار اور بھی ہیں جن میں آج کی زندگی، آج کے سماجی ماحول پر لطیف وعمیق اشارے ملتے ہیں۔ آج کی صنعتی زندگی، بازار کی چمک دمک، نئی طبقاتی کشمکش، اقتصادی ناہمواریاں۔ ان سب نے مل کر نئے سماج کی جو تصویر اُبھاری ہے وہ بڑی ہی عجیب وغریب ہے جس کی بوالعجبی وپیچیدگی کے اشارے بالا اشعار میں دیکھے جاسکتے ہیں، لیکن ان کی واضح اشاریت بلکہ حقیقت ایک پیچیدہ و بے رحم حقیقت کی شکل میں فکشن میں زیادہ نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے، اس لیے کہ فکشن میں پھیلاؤ ہوتا ہے اور واقعات کا گھیراؤ بھی اور وقت کا بدلاؤ بھی— آخری جملہ کے بارے میں آج کے ممتاز افسانہ نگار سید محمد اشرف نے ایک جگہ لکھا ہے:

''ہمارے عہد میں بیدی، کرشن، منٹو کی بیکس عورتیں نہیں ہیں جسم فروشی جن کی مجبوری ہو۔ اب جسم بازار کا ایک کمرشیل مارکیٹ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ آج کے معاشرے میں کسی جسم فروش کو رنڈی نہیں کہا جاسکتا اسے Sex Worker کے طور پر سماج میں قبولیت حاصل ہو چکی ہے۔

یہ محض ایک اشارہ ہے— اسی طرح گاؤں وہ گاؤں نہیں رہے، دلت وہ دلت نہیں رہا، عورت وہ عورت نہیں رہی— تاہم انسانی فطرت وجبلت تو وہی ہے طاقت اور ناطاقتی کی، کمزور اور مضبوط کی، کمزور انسان اور جوان عورت بھی کہیں نہ کہیں آج بھی مظلوم ومجبور ہے۔ یہ باتیں عورتیں زیادہ کہہ رہی ہیں۔ ذکیہ مشہدی، شائستہ فاخری، نگار عظیم وغیرہ کے افسانے بطور خاص پیش کیے جاتے ہیں جس سے نئے ادب میں تانیثیت کی بحث چل رہی ہے اور چلنی بھی چاہیے۔ اسی طرح بدلے ہوئے روپ میں دلت کے مسائل آج بھی ہیں— اسی لیے دلت ڈسکورس بھی قائم ہو چکا ہے، جو اردو ناول میں دویہ بانی سے لے کر تحم خوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اردو ادب میں ادھر ناول نگاری کا رجحان بڑھا ہے۔ گزشتہ دس ماہ میں تقریباً دس نئے ناول منظر عام پر آئے ہیں۔ یہ خوشی کی بات تو ہے لیکن غور طلب یہ ہے کہ ان میں موضوعات کی سطح پر ثروت مندی کم دکھائی دیتی ہے۔ بیشتر میں مرد اور عورت کے رشتے، گم ہوتی ہوئی انسانی و اخلاقی تہذیب، اقلیت کے مسائل یا خواتین کے مسائل— حالانکہ اس میں مانجھی جیسا ناول بھی ہے جو صارفیت پر ہے اور آتش دان جیسا ناول بھی جس میں عام انسانوں کا سنگھرش ہے۔ آج افسانے لکھے جا رہے ہیں اور شاعری بھی ہو رہی ہے، لیکن عام خیال ہے کہ ان میں وہ پہلے والی توانائی و گہرائی نہیں ہے، ہوسکتا ہے یہ سچ ہو لیکن تنقید بھی صرف فیصلے تو نہیں کرتی بلکہ اس کے اسباب وعلل تلاش کرتی ہے، لیکن عام خیال ہے کہ آج تنقید تخلیق سے بھی زیادہ کمزور ہوگئی ہے، اپنی راہ سے بھٹک گئی ہے، ہوسکتا ہے یہ بھی سچ ہو، لیکن تنقید کا رشتہ تخلیق سے ہوا کرتا ہے، اگر تخلیق کمزور ہوگی تو تنقید از خود کمزور ہو جائے گی اور وہ نئی نئی تعریضوں و بحثوں میں الجھ جائے گی جیسا کہ ان دنوں ہو رہا ہے۔

سارا معاملہ یہ ہے کہ ہماری فکر بھٹک گئی ہے، اس لیے کہ ہمارا سماج، ہمارا معاشرہ اور ہماری زندگی اُلجھ کر رہ گئی ہے— شاعر وادیب بھی انسان ہی ہوتا ہے اور اسی معاشرہ میں وہ جیتا مرتا ہے— لیکن اگر وہ شاعر ہے، ادیب ہے تو اس کے معاملات غور وفکر سے ہوں گے۔ تصور وتخیل سے ہوں گے۔ اس لیے کہ تخلیقِ ادب کے لیے یا بڑی شاعری وافسانہ نگاری کے لیے مسائل کا صرف جاننا ضروری نہیں ہوا کرتا، بلکہ مسائل کی گہرائی میں اُترنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ جمیل جالبی نے کہا تھا:

''وہ لوگ جو زندگی میں تخلیقی کام کرتے ہیں، وہ کام اس وقت تک انجام نہیں دے سکتے جب تک معاشرہ سے ان کا گہرا تعلق نہ ہو۔ ان کو دیکھنا— اپنے اندر اُتار لینا اور ان کا اظہار کرنا۔ یہی اس کا فن ہے اور یہی اس کی سماجی ذمہ داری۔''

علامہ اقبال نے بھی کہا تھا:

''بلند ترین آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر خفیہ قوتوں کو بیدار کرے تاکہ ہم زندگی کی مشکلات کا کامیابی سے مقابلہ کرسکیں:

بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

کچھ یہ بھی ہے کہ اردو شعر وادب نے ماضی سے ہی کچھ ایسے پیمانے، سانچے بنا لیے ہیں جن سے ادب اور سماج کے رشتوں پر گفتگو کم سے کم ہوئی۔ نفسیات اور جمالیات کا محدود، معیار پرستانہ تصور ہی رائج کیا، زمینی اور حقیقی مسائل کو خارجی سمجھ کر باطنی کیفیات میں اُلجھے رہے اور عشق وعاشقی کا کھیل کرتے رہے۔ یہ تو کہیے کہ درمیان میں صوفی شعرا

آئے اور انھوں نے تصورِ عشق کو بڑا کیا۔ نظیر نے عوامی شاعری، انیسؔ نے رزمیہ شاعری، چکبستؔ نے قومی شاعری اور اقبال نے فلسفیانہ شاعری کر کے شعریات کے دائرے کو پھیلا دیا، جس پر ترقی پسند شاعری نے اپنی بنیاد رکھی اور حسن کا تصور ہی بدل کر رکھ دیا۔ اب حُسن دھنیا میں تھا، بوڑھی کاکی، تائی اسیری اور ننھی کی نانی میں سمٹ آیا۔ یہ سب اس لیے بھی ہوا کہ شاعروں، فنکاروں نے ادب کو صرف ادب نہیں رہنے دیا بلکہ زندگی اور سماج سے مضبوط رشتے قائم کیے — یہ سلسلے تو آج بھی جاری ہیں۔ عوامی و اجتماعی ادب آج بھی ہے، لیکن ان میں سماجی ذمہ داری اور والہانہ سپردگی کم سے کم ہے — تخلیقی ادب محض اطلاع یا اخبار کے ذریعہ نہیں لکھا جاتا جب تک کہ گہرا مشاہدہ اور تجربہ نہ ہو اور ایک نظریہ و فلسفہ نہ ہو۔ اس درمیان یہ بھی ہوا کہ دنیا انسانی راحت کدہ کم بازار زیادہ بن گئی۔ ترقیوں نے اسے ایک ایسے صارفانہ و تاجرانہ ماحول میں لا کھڑا کر دیا ہے کہ یہاں فکر و خیال بھی بازار کا حصّہ بن گئے۔ قلم اور ذہن بھی — جس کی ضرورت ہے وہی مال پیش کیا جا رہا ہے چینلوں، مشاعروں وغیرہ میں بطورِ خاص۔

آج کی دنیا میں انسان آزاد ضرور ہے، لیکن اپنی ضرورتوں، لالچوں میں قید بھی ہو گیا ہے۔ آج کی سیاست اور صارفین نے اسے گھیر لیا ہے — اخلاقی و انسانی اقدار کا زوال آ گیا ہے۔ ایسے میں شاعروں و ادیبوں کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ شعر و ادب ہی راہِ نجات بھی ہے اور راہ نجات بھی — مگر آج کی مشینی دنیا نے عام انسانوں کو کتابوں سے دور کر دیا ہے چنانچہ اطلاعات کے اس دور میں ہم غور و فکر اور ادراک و آگہی سے بھی دور ہو گئے ہیں۔ ہماری قوتِ فکر اور قوتِ تخلیق کو بھی سلب کر دینے کی کوششیں کی جا رہی ہیں اور شاعر سوال قائم کر رہا ہے:

چاند کے نزدیک ہے یہ آدمی
آدمی سے دور کیوں ہے آدمی

شعر و ادب کا کام بیدار کرنا ہے — اس کے لیے کبھی کبھی غیر ادب کو دائرۂ ادب میں لانا پڑتا ہے۔

بنجر زمین پر بھی کام کرنا پڑتا ہے
آتش نمرود کو گلزار خلیل بنانا پڑتا ہے

کہا جا سکتا ہے کہ ادیب و شاعر تو بعد میں خود ادب بھی آج سوالیہ نشان کے گھیرے میں ہے اور ادب بھی اس لیے گھیرے میں ہے کہ انسان چاروں طرف سے نرغے میں ہے۔ ہمیں سب سے پہلے انسان کی انسانیت اور احترامِ آدمیت کی فکر کرنی ہے — اگر اس کا جلال زندہ ہے تو ادب و شاعری کا جمال بھی زندہ رہے گا۔

○○

مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے

بیسویں صدی کے عظیم مذہبی، فکری، سیاسی پیشوا مولانا ابوالکلام آزاد کی برگزیدہ شخصیت اور ان کے علمی، عملی کارناموں پر اہم دستاویز۔

اردو اکادمی، دہلی نے ''مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت اور کارنامے'' کے عنوان سے جو کل ہند سمینار منعقد کیا تھا اس میں پڑھے جانے والے مقالے اس کتاب میں یکجا کر دیے گئے ہیں جو چھ حصوں میں تقسیم ہیں۔ سیرت و شخصیت، سیاست، مذہب، ادبی نثر، صحافت اور شاعری۔ اس کتاب میں جو مقالے شامل کیے گئے ہیں ان میں کوشش کی گئی ہے کہ مولانا کی شخصیت اور کارناموں کے ہر پہلو پر خاطر خواہ روشنی پڑ جائے۔

مولانا کی شخصیت اور کارناموں سے مکمل آگاہی کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل مولانا کے مکمل سوانح حیات درج کیے گئے ہیں اور مولانا کی تاریخی اور اہم ترین تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔

مرتب: ڈاکٹر خلیق انجم، قیمت: ۱۰۰ روپے، صفحات: ۵۰۲ (چھٹا ایڈیشن)

ناشر: اردو اکادمی، دہلی